پہلی اشاعت ستمبر ۱۹۴۷ء

قیمت بارہ آنے

فیروز مستری نے قادری پریس بمبئی نور منزل محمد علی روڈ سے چھپوا کر
کتب پبلشرز لمیٹیڈ ۔ ۱۱ اگن لوا اسٹریٹ بمبئی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

اُردو، ہندی، ہندستانی
کا مسئلہ

غالباً اس وقت ہمارے ملک میں کوئی تہذیبی مسئلہ اس قدر الجھا ہوا نہیں ہے جتنا کہ اُردو، ہندی اور ہندستانی کا مسئلہ ہے۔ اردو اور ہندی کے حامیوں میں اِن دونوں زبانوں کی اصل، ان کی ترقی و فروغ، ان کی موجودہ حالت و کیفیت اور مستقبل میں ان کے ارتقا کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے، انتہا یہ ہے کہ اُردو کے بعض طرفدار ہندی کے اور ہندی کے بعض جوشیلے مدعی اردو کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہمارے ملک کی یہ بڑی بولیاں بازیں تنگ نظری، ضد اور شرارت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔

مثلاً آنجہانی پنڈت رام چندر شکل، جنھوں نے ہندی ادب کی

نہایت طالبانہ تاریخ لکھی ہے اردو کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ کھڑی بولی کا بکرتم سبب ادبی میں بگڑا ہوا نقلی روپ ہے، اس کا اصلی روپ ہندی ہے۔

ڈاکٹر دھیریندر ورما، الہ آباد یونیورسٹی میں شعبہ ہندی کے صدر لکھتے ہیں:۔

"چونکہ ہمارے حاکم اب بدل گئے ہیں (یعنی مسلمانوں کی جگہ انگریز ہندوستان کے حکمراں ہیں) اس لئے پہلے کے مقابلے میں اب اردو کا مستقبل اتنا روشن نہیں رہا"

پنڈت امرناتھ جھا، وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی فرماتے ہیں:۔

"اردو کی تمام تر فضا اور روح بدیسی ہے، ہندوستانی نہیں"

اب اردو کے حامیوں کی ہندی کے متعلق جو رائے ہے وہ بھی سنئے:۔

میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر "ہمایوں" لکھتے ہیں:۔

"جدید ہندی ایک مصنوعی زبان ہے"

مولوی عبدالحق صاحب کا فرمانا ہے کہ:۔

"اردو ہندی کی ترقی یافتہ شکل ہے"

آپ کے نزدیک جدید ہندی، ہندو تعصب اور فرقہ پرستی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ ڈاکٹر شیخ سید محمد بھی ہندی کے متعلق ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو ہندی کے نام سے چڑھتا ہے۔

جب ہندوستان کی ایک مشترکہ قومی زبان کا سوال اٹھتا ہے تو اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہندی کے حامی کہتے ہیں کہ ہندوستان کی راشٹر بھاشا ہونے کا حق صرف ہندی کو ہے۔

اردو والے اعلان کرتے ہیں کہ اردو ہی اس ملک کی قومی زبان بن سکتی ہے۔

ہندی والے اردو والوں کو، اور اردو والے ہندی والوں کو قائل نہیں کر سکتے۔

گاندھی جی نے حال میں ایک درمیانی صورت نکالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن خود کانگریس کے تمام لوگ اس معاملے میں گاندھی جی سے متفق نہیں ہیں۔ ایک طرف بابو پرشوتم داس ٹنڈن، سمپورنانند جی، اور ہندی ساہتیہ سمیلن کی اکثریت ہے۔ اس گروہ کا کہنا ہے کہ:

"ہمیں ڈر ہے کہ ہندوستانی کا مبہم نام رہنے کر ملک پر کہیں اردو نہ ٹھونس دی جائے" (سمپورنانند جی کا بیان)

دوسری طرف جمعیت علماء اور اکثر مسلمان کانگریسی ہیں جو گاندھی جی سے اس معاملہ میں اتفاق نہیں کرتے۔ انھیں یہ ڈر ہے کہ ہندوستانی کے نام پر کہیں ہندی کا پرچار نہ شروع ہو جائے۔

ان مختلف گروہوں کے درمیان گاندھی جی [illegible] ہیں۔ اردو کی حمایت کرنے والوں کی اکثریت بھی گاندھی جی کے تصور

والی ہندستانی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے ۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں تہذیبی میدان میں گویا دو ایسے کیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ اور یہ تہذیبی جنگ دن بدن زیادہ شدید ہوتی جاتی ہے۔

دونوں فریق صرف اپنے کو سچائی پر سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف انھیں صرف جھوٹ اور ضد اور تعصب نظر آتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ ٹھیک ہے جو اردو والے ہندی کے متعلق اور ہندی والے اردو کے متعلق سوچتے ہیں، اور اگر ان دونوں زبانوں کی بنیاد مصنوعی اور غیر فطری ہے تو پھر اس کا کیا سبب ہے کہ ان دونوں زبانوں کی دن بدن ترقی ہو رہی ہے، اور ان کی مقبولیت عوام میں بڑھ رہی ہے؟ ان میں ہماری قوم کے بہترین علمی، سیاسی، فلسفیانہ، مذہبی اور ادبی خیالات و جذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے؟ ہندستان کے ان علاقوں میں بھی جہاں دوسری زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں، اردو اور ہندی کو لوگ شوق سے پڑھتے ہیں اور موقع پڑنے پر بولتے بھی ہیں۔ اردو اور ہندی کو ہندستان میں ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔ بہت سے لوگ جو ہندستان کی دوسری زبانیں بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں۔ اردو یا ہندی بولنا اور پڑھنا اپنا قومی فرض سمجھنے لگے ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور اردو کی دوسری انجمنیں کالی کٹ سے لے کر آسام تک اور چٹ گاؤں سے لے کر کراچی تک پھیل گئی ہیں۔ اسی طرح ہندی کو بھی سارے ہندستان میں بہت زبردست مقبولیت حاصل ہو چکی

ظاہر ہے کہ جب تک کسی زبان کی جڑیں کسی قوم کی تہذیبی اور روحانی روایات میں پیوستہ نہ ہوں اور جب تک اس کی بنیاد کسی ایسی زندہ بولی پر نہ ہو جو کسی خاص گروہ یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ عوام میں بھی رائج ہو، اس وقت تک وہ عمومی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی، اور ایک جمہوری اور ترقی پذیر سماج میں کلچر کے ارتقاء کی آلہ کار نہیں بن سکتی۔ چونکہ اردو اور ہندی ایسی زبانیں ہیں اس لئے وہ ترقی کر رہی ہیں، اسی لئے ان میں صلاحیت ہے کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے حصوں کی تعلیم کا ذریعہ اور وسیلہ بنیں۔ ان میں اس کی بھی صلاحیت ہے کہ وہ ہندستان کے مختلف زبان بولنے والے علاقوں کے لوگوں کی مشترک زبان ہوں۔

اُردو کی ابتدا کیسے ہوئی؟

مسلمان جب ہندستان میں گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں آئے تو ان کا سیاسی مرکز وہ علاقہ تھا جو لاہور سے لے کر دہلی، آگرہ اور میرٹھ تک پھیلا ہوا ہے۔ گریرسن نے اس کو لسانی اعتبار سے مغربی ہندی کے علاقے میں شامل کیا ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ شاخیں ہیں۔ بانگڑو۔ کھڑی بولی، برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی۔ دلی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بانگڑو اور کھڑی بولی بولی جاتی تھیں۔ باہر سے آنے والے مسلمان ترکی یا فارسی بولتے تھے اب کھڑی بولی میں ترکی اور فارسی کے الفاظ ملنے شروع ہوئے۔ مسلمان حکمرانوں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ لیکن زندگی اور حکومت کی ضرورتیں انھیں عام

لوگوں کی زبان کا استعمال کرنے پر مجبور کر رہے تھے، اسی طرح سے عام لوگوں کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنی بات سننے آنے والوں کو سمجھا سکیں۔

حکمرانوں سے دور مسلمان صوفیوں اور فقیروں کا طبقہ تھا جو اپنا پیام اس ملک کے عوام تک پہونچانا چاہتا تھا۔ یہ لوگ عربی، فارسی اور ترکی کے عالم تھے۔ لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ اپنے روحانی پیام کو ہندستان کے عام لوگوں تک پہونچانے کے لئے یہاں کے علوم مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی دور کے مسلمان علماء اور صوفیا سنسکرت اور یہاں کی دوسری زبانوں کو سیکھتے اور پڑھتے تھے اور ہندستان جیسے متمدن ملک کے مذہبی رجحانات سے متاثر بھی تھے۔ کھڑی بولی میں فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ سب سے ابتدائی فقرے اور چند اشعار مشہور درویش اور صوفی بابا فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ بابا فرید خود اس زبان کو ہنڈی یا ہندوی کہتے تھے۔ بابا فرید بارھویں صدی کے آخر ۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے، اور آپ کا انتقال ۱۲۶۵ء میں ہوا۔ آپ کا مزار پاک پٹن میں ہے جو لاہور کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان درویش اور مبلغ اپنے مذہبی وعظ یہاں کی ہی زبانوں میں کرتے ہوں گے۔ حافظ محمود شیرانی صاحب اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں شیخ اسماعیل لاہوری کی مجالس وعظ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو شریک ہوتے تھے یہ بھی تیرھویں صدی کی بات ہے۔ یہی صدی امیر خسرو کی بھی ہے جنھیں جدید اردو اور ہندی کا جنم داتا کہا گیا ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ امیر خسرو سلطان

دہلی کے دربار سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ہمارے ملک کے بہت بڑے عالم، شاعر ماہرِ موسیقی، درویش اور صوفی تھے۔ اور حضرت نظام الدین اولیا کے محبوب مریدوں میں سے تھے۔ امیر خسرو نے جب خواجہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو اپنا لاکھوں روپیہ کا مال و زر غریبوں میں بانٹ دیا۔

خسرو کی مکریاں، پہیلیاں، دو سخنے، ڈھکو سلے ہماری زبان کی عوامی اصل کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ خسرو نے جو زبان استعمال کی وہ ان کی اختراع کی ہوئی نہیں ہے۔ لیکن ان کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے اپنے آس پاس کی مروجہ عوامی زبان کو ایسی ادبی تخلیق کے لئے استعمال کیا، جو عوام سے متعلق تھی اور جو عوام کے لئے تھی۔

یہی صوفی، فقیر درویش اور شمالی ہندستان میں رہنے والے عام لوگ جب مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ گجرات اور دکن گئے تو اس زبان کو اپنے ساتھ وہاں بھی لے گئے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی تھی، اور دربار اور جاگیری طبقے سے متعلق جس قدر بھی ادب اور دیگر علمی یا مذہبی مضامین کی تخلیق ہوتی تھی اس کی زبان فارسی ہوتی تھی۔ ہندی یا ہندوی نیچے کے نیم تعلیمیافتہ یا غیر تعلیم یافتہ عوام میں استعمال ہوتی تھی اور ابھی تک ادبی درجہ حاصل نہیں کر سکی تھی۔ صرف وہ لوگ جن کا تعلق عوام سے تھا، جو عوام تک اپنا پیام پہونچانا چاہتے تھے۔ اور جو عوام پر روحانی اثر ڈالنا چاہتے تھے اس بولی کو استعمال کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اردو نثر کا سب سے پہلا رسالہ حضرت گیسو دراز بندہ نواز کا لکھا ہوا ہے۔ حضرت گیسو دراز بندہ نواز تعلیم و تبلیغ

کے لئے دلی سے چل کر گجرات آ گئے۔ اور آخر میں گلبرگہ میں آ کر متوفی ہوئے۔ آپ کا رسالہ معراج العاشقین غالباً ۸۰۲ھ ۱۴۰۰ء یعنی چودھویں صدی کے خاتمہ پر لکھا گیا ہے۔ تقریباً ایک سو سال بعد (۹۰۲ھ ۱۴۹۵ء) حضرت شاہ میرانجی شمس العشاق کی شرح مرغوب القلوب ملتی ہے۔ جس کی زبان معراج العاشقین کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ میرانجی کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری نے نظم و نثر دونوں لکھی جس کے نمونے ملتے ہیں۔ آپ کی وفات کی تاریخ ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء ہے۔ سترہویں صدی کے اوائل میں بھی صوفیا اور مشائخ کے لکھے ہوئے مذہبی رسالے اور نظمیں ملتی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملا وجہی کی قطب مشتری (۱۰۱۸ھ ۱۶۰۹ء) سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ – ۱۶۱۱) کی ابتدائی منظومات، اور ۱۰۴۵ھ ۱۶۳۵ء میں تحریر شدہ سب رس کے پہلے، بابا فرید گنج شکر کے زمانے سے لے کر سترھویں صدی کے شروع تک، یعنی تقریباً پانچ سو سال تک کھڑی بولی ہندی یا ہندوی کے نام سے صوفیا، مشائخ، فقرا اپنی مذہبی تبلیغ کے لئے استعمال کرتے رہے۔

یہاں پر یہ امر بھی توجہ کے قابل ہے کہ اس زمانے میں ہمارے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی ایک زبردست تحریک جاری تھی۔ تصوف کا فلسفہ ہمہ اوست، اور ویدانت کے بھگتی کے تصور میں نہ صرف گہری مشابہت تھی بلکہ یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ یہ دونوں اسلامی اور ہندو تصورات ایک دوسرے پر اثر انداز تھے۔ مسلمان اور ہندو صوفی اور بھگت ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اور طریقت و معرفت کی جستجو میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔

مثال کے طور پر حضرت گیسو دراز کا رسالہ معراج العاشقین لیجئے۔ تصوف و معرفت کے مسائل کے سلسلے میں آپ نے جو اصطلاحیں اس رسالے میں استعمال کی ہیں وہ سنسکرت کی وہ اصطلاحیں ہیں جو اس زمانے کے ہندستان میں ہندو سنت استعمال کرتے تھے۔ مثلاً نرگن، سگن وغیرہ۔

حالانکہ صوفیا و شائخ کے رسالوں اور ان کی منظومات کی زبان ادبی اعتبار سے بلند درجہ کی نہیں ہے۔ لیکن اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خالص ہندستانی الفاظ بکثرت اور بغیر کسی جھجک کے استعمال کئے گئے ہیں۔ ہندی چھند (بحروں) کا بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً شاہ برہان الدین جانم کی سکھ سہیلا ہندی چھند میں ہی لکھی گئی ہے۔

ان تمام باتوں کے مدنظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ:۔

(۱) اردو کی ابتدا جب کہ اس کا نام ہندی یا ہندوی تھا، یہاں کی کھڑی بولی میں فارسی ترکی اور عربی کے اُن الفاظ کے ملنے سے ہوئی جسے باہر سے آئے ہوئے عام مسلمان بولتے تھے۔

(۲) اس زبان کی نحوی ساخت خالصاً ہندستانی ہے۔

(۳) شمالی ہندستان کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہ ہندستان کے مختلف علاقوں میں پھیلی اور پھر جس علاقے میں گئی وہاں کے مقامی اثرات اس نے قبول کئے۔

(۴) اس کی ابتدائی تحریری صورت حکمراں مسلم امراء اور ارباب حکومت سے وابستہ نہیں ہے۔ ان کی زبان فارسی یا ترکی تھی۔ تحریری شکل میں اس کا

استعمال پہلے دور میں مسلم صوفیوں اور فقیروں نے کیا۔ یہ خود فارسی اور عربی کے عالم تھے لیکن اپنے مذہبی پیغام کو یہاں کے عام لوگوں تک پہونچانے کے لئے انھوں نے یہاں کی ہی ایک بولی اختیار کی۔

(۵) پھر بھی اس پر مسلمان تہذیب کے اثرات حاوی ہیں، حالانکہ اس کے ابتدائی دور کے تمام مصنف مسلمان ہیں۔ اس کی تمام ابتدائی کتابیں جن کا ذکر اوپر آیا اسلام سے متعلق ہیں۔ اس کا رسم خط فارسی ہے۔ اس کی ابتدائی نثر پر فارسی کا گہرا اثر ہے۔

ہندی کے ابتدائی دور۔ برج بھاشا اور اودھی

جس طرح کھڑی بولی مسلم اثر کے ماتحت ایک نئی شکل اختیار کر رہی تھی اسی طرح ہندستان کی دوسری زبانیں بھی ابھر رہی تھیں۔ بھکتی کی تحریک ہندوؤں میں تیزی سے پھیل رہی تھی اور اس تحریک کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عوام سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے مبلغ عام لوگوں کی بولی استعمال کرتے تھے۔ اس طرح ہمیں نظر آتا ہے کہ بارھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان چندی داس نے سری کرشن کیرتن، گن راج خان نے سری کرشن وجے بنگالی زبان میں لکھی، جنان ایشوری اور ایک ناتھ کی رامائن مرہٹی زبان میں لکھی گئی، آسامی زبان میں شنکر دیو نے بھکتی کے مضامین نظم کئے۔ ودیاپتی نے متھلی میں جگن ناتھ داس نے اڑیا میں بھاگوت پران لکھا، تلسی داس نے اودھی میں رام چرت مانس، کبیر نے اودھی، برج اور کھڑی بولی ملی جلی سدھکڑی میں اور گرونانک نے پنجابی

میں ساکھیاں لکھیں، میرا بائی نے راجستھانی میں اپنے گیت لکھے، اور نرسنگھا مہتا اور پدمنا بھا نے گجراتی میں بھگتی کے گن گائے۔

شمالی ہندوستان میں رام بھگتی کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے شاعر کبیر داس ہوئے ہیں۔ ان کی پیدائش، بچپن میں ان کی تعلیم و تربیت، ان کی زندگی ان کے فلسفۂ حیات اور ان کی موت کے متعلق جو اختلافات ہیں وہ نہایت سبق آموز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک برہمن کے لڑکے تھے۔ جن کو ان کی ماں نے اپنی بدنامی کے خیال سے بنارس کے ایک گھاٹ کی سیڑھیوں پر چھوڑ دیا تھا۔ وہاں سے ایک مسلمان جولاہے نے ان کو اٹھا لیا اور اپنا بچہ بنا کر انھیں پالا۔ اس زمانے میں بنارس میں رام بھگتی فرقہ کے بانی گرو راما نند کا قیام تھا۔ کبیر نے ان سے کسب فیض کیا۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ مشہور صوفی شیخ تقی کے آپ شاگرد تھے۔ کبیر ایک غریب محنت کش انسان کی زندگی بسر کرتے تھے، اور ان کے فلسفہ میں رام سے مراد ایک ہمہ گیر الٰہی قوت ہے جس کی نظر میں ہندو مسلم سب ایکساں ہیں انھوں نے ہندو اور مسلم مذہب دونوں میں مردہ رسم و رواج کی سختی سے مخالفت کی اور دونوں کو ایمان داری، صلح، امن اور بھائی چارے کا سیدھا سادھا لیکن بہت پُراثر پیام دیا۔ کبیر کا جب انتقال ہوا تو ہندو ان کو ہندوؤں کی طرح جلانا چاہتے تھے، مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے، آج مگہر میں کبیر کی جائے وفات پر دو علیحدہ احاطے بنے ہیں۔ ایک میں مسلمان مجاور ہیں دوسرے میں ہندو۔ شمالی ہند کے دیہاتوں میں لاکھوں ہندو اور مسلمان دیہاتی ان کے کلام کو اب بھی پڑھتے اور گاتے ہیں۔

کبیر حالانکہ بنارس اور گورکھپور کے علاقے کے رہنے والے تھے جہاں کی زبان بھوجپوری اور اودھی ہے۔ لیکن یہ بات غور کے قابل ہے کہ ان کی ساکھیوں کی زبان میں کھڑی بولی، راجستھانی اور جنوبی پنجابی کے اثرات بھی ہیں۔ مثلاً کبیر کے یہ بچن دیکھیے۔

کبیر من نرمل بھیا جیسا گنگا نیر

یا۔

کبیر کہتا جات ہوں سنتا ہے سب کوئے
رام کہے بھلا ہوئے گا، ناہیں تر بھلا نہ ہوئے

یا۔

آؤں گا نہ جاؤں گا، مروں گا نہ جیوں گا
گرو کے سبد، رم رم رہوں گا

ان بچنوں میں جیسا۔ کہتا ہوں، سنتا ہوں، جاؤں گا، مروں گا، رہوں گا۔ سب کھڑی بولی کے الفاظ اور ترکیبیں ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی میں ہی کھڑی بولی پھیلنے لگی تھی۔ دوسری بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر ایک طرف مسلمان صوفیا، کے زیر اثر کھڑی بولی کی ادبی ایسی شکل ظاہر ہو رہی تھی جس پر مسلم اثرات حاوی تھے تو اس کا ایک ایسا پہلو بھی تھا جس پر ہندو اثرات حاوی اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ کبیر داس کی شاعری پر مسلم اثرات بھی ہیں۔ انھوں نے فارسی اور عربی کے الفاظ بھی اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں

کہ ان کے کلام کی فضا ہندو ہے۔ ان کے چھند ... تمام تر سنسکرت کے ہیں۔ سنسکرت کے تم سم اور تدبھو الفاظ کا بھی وہ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں؛ اس کے علاوہ کبیر کا کلام ناگری رسم خط میں لکھا گیا تھا۔

سولھویں، سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں شمالی ہند میں اودھی اور برج بھاشا کا بہت عروج ہوا۔ جدید ہندی کے ماخذ کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں ان زبانوں کے ارتقا پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اودھی زبان میں بلند ادبی حیثیت حاصل کرنے والوں میں سب سے پہلا نام ملک محمد کا ہے۔ جو ضلع رائے بریلی کے قصبہ جائس کے رہنے والے تھے۔ ان کی مشہور نظم کا نام پدماوت ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو مثنوی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں چتوڑ کی رانی پدمنی، اس کے شوہر راجا رتن سین اور سلطان علاؤالدین خلجی کے واقعہ کو بنیادی بنا کر اور اس میں کافی اختراع کر کے ملک محمد نے تصوف کے فلسفے کو ایک افسانہ کے روپ میں نہایت دلکش انداز سے پیش کیا ہے۔ ملک محمد کی شاعری اور ان کے تخیل میں ہمیں ہندو مسلم کلچر کا امتزاج بدرجۂ اتم دکھائی دیتا ہے۔ نرگن کا بھکتی تصور یہاں اسلامی تصوف سے پوری طرح مل گیا ہے۔ ملک محمد جائسی نے جو تلمیحات، استعارے اور اشارے استعمال کئے ہیں وہ سب کے سب بھکتی کے ہیں۔ انھوں نے خود ان تلمیحوں کے معنی مندرجہ ذیل الفاظ میں ہمیں بتلائے ہیں۔

تن چتوڑ، من راجا کی ھا
ہیا سنگھل، بدھی پدمنی چین ھا

گرو ستوا جنہی پنتھ دکھادا
بن گرو جگت کو نرگن پادا؟
ناگ متی یہ دنیا دھندھا
بانچا شونی نا اہی چیت بندھا
راگھو دوت سوئی سیطانو
مایا علاؤدی سلطانو

جسم کو چتوڑ اور شعور کو راجہ بتایا۔ دل کو سنگھل کی مملکت اور عقل کو پدمنی شناخت کیا۔ طوطا گرو پیر مرشد ہے جس نے راہ دکھائی بغیر مرشد کے دنیا کو کس نے لاصفات پایا: ناگ متی یہ دنیا دھندا ہے راگھو کا سفیر شیطان اور مایا (پُر فریب خواہشات کی دنیا) سلطان علاؤالدین ہے

جائسی نے پدماوت شیر شاہ کے عہد حکومت میں لکھی یعنی سنہ ۱۵۴۰ء اور ۱۵۴۵ء کے درمیان۔ ان کے بعد یہ طرز کافی مقبول ہوئی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں شیخ عثمان نے اسی طرز کی ایک نظم چترا ولی لکھی۔ ان کے بعد شیخ نبی (گیان دیپ)، قاسم شاہ (ہنس جواہر)۔ نور محمد (اندراوتی) نے سترھویں اٹھارھویں صدی میں اودھی زبان میں اسی قسم کی نظمیں لکھیں۔

ہندی ادب کی تاریخ میں اودھی زبان کی ان نظموں کو " پریم مارگی (صوفی) شاکھا" کا نام دیا گیا ہے۔

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ لسانی اعتبار سے ان نظموں کی کیا اہمیت ہے۔

پہلے تو یہ کہ۔ حالانکہ ان کے لکھنے والے مسلمان تھے، اور انھوں نے تصوف کے فلسفہ کو ہندوستانی لباس میں پیش کیا ہے لیکن ان پر یہاں کے بھکتی فلسفہ کا گہرا اثر تھا جو ان کی شاعری میں بھکتی کی تمام مروجہ اصطلاحوں کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حالانکہ ان نظموں میں مثنوی کی بحر استعمال کی گئی ہے لیکن بقول پنڈت رام چندر شکل کے ان میں

"شرنگار، ویر آدی کے ورنن چلی آتی ہوئی بھارتی یہ کاویہ پرم
پرا کے انوسار ہی ہیں" (ہندی ساہت کا اتہاس صفحہ ۱۱۸)

عشقیہ، بزمیہ اور رزمیہ بیانات شاعری کے روایات کے مطابق ہی ہیں۔

ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں۔ اودھی کے یہ مسلمان ادیب ایک ایسی روایت کے حامل تھے جو کھڑی بولی کے اس طرز سے مختلف تھی جس کی نشوونما مسلمان صوفی اور شاعر اسی زمانے میں دکن میں کر رہے تھے۔ دونوں میں ہندو اور مسلم تصورات اور کلچر کا امتزاج تھا۔ دونوں ہندوستانی تھیں لیکن ایک میں مسلمان تہذیب و تصور کا رنگ حاوی تھا اور دوسرے میں ہندو تہذیب و فلسفہ اور تصور کا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جائسی اور ان کے پیروؤں کی زبان اودھ کے شہروں اور دیہات میں رہنے والے عوام کی زندہ بولی تھی جن کی بہت بڑی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔

شاعر اعظم گوسائیں تلسی داس جی کی شاعری میں یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہندو تصورات و ادب کا ایک نرمل دھارا مسلمانوں کے عہد حکومت میں بڑی شان و شوکت سے بہتا رہا۔ تلسی داس جی برہمن تھے اور ہندو الٰہیات کے

بہت بڑے عالم تھے۔ وہ سنسکرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے کاشی میں سنت راماننددکے شاگرد اور چیلے سنت نرہری سے کسب فیض کیا تھا۔ ان کی ذات میں شمالی ہندوستان میں رہنے والی ہندو قوم کے بہترین مذہبی سفیانہ، ادبی اور اخلاقی خیالات کا امتزاج ہوا تھا۔ چونکہ وہ ایک سچے شاعر اور ادیب تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بلند پایہ خیالات کے اظہار کے لئے عوام کی اودھی زبان استعمال کی۔ انھوں نے اس زبان کو ہندوؤں کے بہترین اور بلندترین اخلاقی اور روحانی تصورات سے مالامال کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری صدیوں کے گذرنے کے بعد آج بھی زندہ ہے اور شمالی ہندوستان میں رہنے والے ہندو خواص و عوام میں اب بھی بڑے شوق اور احترام سے پڑھی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ عربی یا فارسی کے وہ الفاظ جو اودھی میں شامل ہو گئے تھے۔ تلسی داس نے بے تکلفی سے انھیں اپنی رامائن میں استعمال کیا ہے۔

اودھی سے بھی زیادہ برج بھاشا کو ترقی ہوئی برج کے سب سے بڑے شاعر سورداس بھی ہوئے ہیں۔ یہ آگرہ ضلع کے رہنے والے تھے۔ لیکن متھرا میں جا کر بس گئے تھے۔ وہاں یہ کرشن بھکتی فرقہ کے رہنما بلبھ آچاریہ کے مقرب شاگردوں میں ہو گئے۔ سورداس سنت، شاعر اور ماہر موسیقی تینوں تھے۔ ان کا سارا کلام شری کرشن جی کی بھکتی میں لکھا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا کرشن جی کے متعلق گیتوں کے لئے خاص موزونیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ کرشن اور رادھے کے متعلق پریم اور برہ سے بھرے گیت ایک طرح سے معمولی انسانوں کے عشق و محبت کی نشانیاں بن کر بہت تیزی سے ہندوستان

کے مختلف حصوں میں پھیل گئے۔ تین سو سال تک بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی تقریباً سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک برج بھاشا میں شاعری کا ایک زبردست اور ہمہ گیر دھارا بہتا رہا۔

برج بھاشا کے بڑے بڑے جید شاعر مغل بادشاہوں کے دربار میں شاہی شاعروں کی طرح موجود رہتے تھے۔ اکبر خود برج بھاشا میں شاعری کرتا تھا اور اس کے دربار کے مشہور امیر عبدالرحیم خان خاناں کا شمار برج کے بزرگ ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد مسلمانوں نے برج بھاشا میں اعلیٰ درجہ کی شاعری کی ہے۔ دلی کے ایک پٹھان رس کھان کے متعلق تو ہندی کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اپنی شیرینی اور لطافت کے لحاظ سے بعض مرتبہ وہ سورداس سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ انھیں کرشن جی سے بہت گہری عقیدت تھی۔ اسی سلسلے میں ان کا مشہور سویّا ہے۔

مانُس ہوں تو وہی رس کھان بسوں برج گوکل گانو کے گوارن،
جو پسو ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند کی دھینو منجھارن،
پاہن ہوں تو وہی گر کو جو دھریو کر چھتر پرندر دھارن،
جو کھگ ہوں تو بسیرو کروں مل کالندی کول کدمب کی ڈارن،

اے رس کھان اگر دوبارہ جنم لے کر میں انسان کے قالب میں آؤں تو میری یہی تمنا ہے کہ برج کے گوکل گاؤں کے گوالوں میں میرا گھر بنے۔ اگر مجھے حیوان کا جنم ملے تو میرا کیا اختیار ہے۔ اس حالت میں میں یہی چاہوں گا کہ ہمیشہ نند (کرشن کے باپ) کی گایوں کے ساتھ ساتھ چرتا رہوں۔ اگر دوسرے جنم میں پتھر ہی مجھے ہونا ہے تو میں اس پہاڑ کا پتھر ہونگا جسے کرشن جی نے چھتری کی طرح اوپر اٹھا کر اندر کے طوفان سے لوگوں کو بچایا تھا۔ اگر پرندہ ہوں تو میں جمنا کے کنارے کدمب کی شاخوں میں بسیرا کروں۔

برج بھاشا کے ان سنعد د مسلمان شاعروں کے متعلق جدید ہندی کے پہلے بڑے ادیب بھارتیندو ہریش چندر نے بڑے جوش سے لکھا ہے۔

"ان مسلمان ہری جنن پے کوٹن ہندن واریئے !"

ان مسلمان ہری کے بھگتوں پر کروڑوں ہندوؤں کو نثار کیجے

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں برج بھاشا میں بھگتی کی متصوفانہ شاعری کا رنگ پھیکا پڑ کر دربار کی وہ حسن و عشق کی شاعری شروع ہوتی ہے جس کا دائرہ خیال بہت محدود سا ہو جاتا ہے۔ برج بھاشا میں شاعری کے اس دور کو ہندی ادب کے مورخوں نے "ریت کال" کا نام دیا ہے۔

ریت کال کے شاعروں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سنسکرت شاعری کے آخری دور کی مطابقت کرتے ہوئے انسان کے مختلف جذبات کو شاعری کی زبان میں ادا کرتے تھے اور اپنے اشعار اور نظموں کو سنسکرت کے اصول شاعری کے مطابق صنائع و بدائع سے مرصع کرتے تھے۔ اسی لئے اس شاعری کو ریت کے مطابق یعنی قدیم رسوم کی پابند شاعری کہا گیا ہے۔ ریت کال کے شاعروں نے بھارت منی کے بتائے ہوئے نو مختلف انسانی جذبات یا رسوں میں سے شرنگار رس کو خاص طور سے چنا تھا، اس رس کا تعلق خاص وصل و فراق کے سلسلے میں پیدا ہونے والے مسرت و غم کے جذبات سے ہے۔ اسی لئے ریت کال کی شاعری کا اکثر و بیشتر حصہ عشقیہ شاعری پر محمول ہے۔

دو سَو سال تک، یعنی تقریباً سنہ ۱۶۵۰ء سے لے کر سنہ ۱۸۵۰ء تک ریت کال کے شاعر ہندستان کے ہر ایک بادشاہ، راجا، مہاراجا اور نواب کے

درباروں میں ہوتے تھے۔ کیشو، چنتامنی، بھوشن، منی رام، بہاری، دیو، پدماکر اس دور کے بڑے بڑے شاعر ہیں۔ امراء کے درباروں سے منسلک ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں جنسی عیش پرستی کا رنگ غالب ہوگیا ہے اور ان کی اخلاقی سطح اس سے قبل کے دور کے سنتوں کی شاعری سے بہت پست ہے جو عوام سے زیادہ قریب تھی، لیکن زبان کی ترقی کے اعتبار سے ہم اس دور کے ادب کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔

پہلے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ برج بھاشا کا یہ ادب برج کے علاقے سے نکل کر ہندستان کے مختلف حصوں میں پھیل گیا۔ راجپوت اور مرہٹہ اور وسطی ہندستان کے ہندو راجاؤں اور امراء کے درباروں میں برج بھاشا ہندو تہذیب کا ایک وسیلہ اور آلہ بن کر پہونچی اور وہاں اس نے گھر کرلیا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہاں کے لوگوں نے اپنی مقامی بولیاں چھوڑ دیں، اس کے یہ بھی معنی نہیں ہیں کہ برج بھاشا کے علاوہ وہاں دوسری زبانوں کو ادبی یا تہذیبی رتبہ حاصل نہیں تھا، لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ برج بھاشا کا یہ ادب غیر برج لوگوں کے لئے بھی تہذیب کا ایک آلہ تھا۔

دوسرے یہ کہ یہ ادب اپنی زبان، اپنی شاعری کے اصول، اپنی فضا کے لحاظ سے ہندستان کی زندہ ہندو تہذیب کا آئینہ دار تھا یعنی یہ تہذیب ہر طرف سے اثرات قبول کر رہی تھی اور کئی صدیوں مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے اور میل جول سے اس میں ایک ہندو مسلم تہذیب کا امتزاج نظر آتا ہے۔ پھر بھی اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ہندو روایات کا رنگ اس پر غالب

ہے۔ اسی وجہ سے اس کے زیادہ تر شاعر اور مربی ہندو ہیں اور وہ مسلمان بھی جو اس زبان اور طرز میں شاعری کرتے ہیں۔ ہندو اور سنسکرت طرز کو قبول کرتے ہیں۔ ریت کال کے شاعروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ سنتوں کی شاعری کے مقابلے میں ان کے یہاں سنسکرت کی آمیزش زیادہ ہے۔ ان میں سے کئی سنسکرت کے بڑے بڑے آچاریہ تھے۔ ان کے لئے سنسکرت کے الفاظ کو اپنی شاعری میں ملا لینا بالکل ایک فطری سی چیز تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انھوں نے فارسی اور عربی کے مروجہ لفظوں کو ترک کر دیا ہے۔ وہ بے تکلفی سے ان الفاظ کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی ہندو تہذیب کے غالب عنصر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اُرْدُو کا ارتقاء

آیئے اب دیکھیں کہ اس زمانے میں کھڑی بولی کا ارتقاء کس طرح ہو رہا تھا۔ سترھویں صدی میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی دکنی سلطنتوں میں کھڑی بولی نے اپنی دکنی شکل میں غیر معمولی ترقی کی۔ اس میں نہایت بلند پایہ ادب کی تخلیق ہوئی۔ صوفیوں اور مشائخ کے تکیے سے نکل کر اسے دربار اور امراء کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ نظم کی اصناف میں مثنوی، غزل، قطعات، اور لمبی لمبی خالص ہندی چھند میں چیزیں لکھی گئیں۔ یہی نہیں، نثر جو ادب و خیال کی بہت بلند ترقی کی نشانی ہے دکن میں شروع ہوئی۔ اور اس نے بلند رتبہ حاصل کیا۔ دکن کے سولھویں صدی عیسوی کے ادیبوں میں وجہی، محمد

قلی قطب شاہ، نشاطی اور نصرتی دکنی اردو کے اساتذہ میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ اس اردو پر دکن کی ہندو اقوام گجراتی، مرہٹی، تلنگی اور کناڈا کا اثر نمایاں ہے پھر بھی اس پر مسلمانوں کی تہذیب و تصورات کا اثر غالب ہے۔ مغلوں کے حملے اور دکن کی فتح کے بعد اورنگ آباد کے مرکز سے ایک بار پھر شمالی ہند میں مروجہ کھڑی بولی کا اثر دکن کی اردو پر براہ راست پڑا اور دکن کے سب سے بڑے شاعر ولی کے کلام میں یہ امتزاج صاف نظر آتا ہے۔ اسی سبب سے ولی کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ شمالی ہند کے دہلوی شعراء پر اتنا زبردست اور فیصلہ کن اثر ڈال سکے۔

ولی کے بذات خود دلی پہونچنے کے پہلے ان کی شہرت اور غالباً ان کا دیوان دلی پہونچ چکا تھا۔ لیکن یہاں کے حالات دکن سے بہت مختلف تھے امیر خسرو نے جس سلسلے کو شروع کیا تھا وہ دلی اور شمالی ہندوستان میں آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ یہاں فارسی کا دور دورہ مکمل تھا۔ اکبر کے زمانے سے مغلوں کے سرکاری دفاتر کی زبان فارسی ہو گئی۔ اکبر کے ہی زمانے میں تعلیم کا جو نظام قائم کیا گیا تھا اس میں بھی فارسی ذریعہ تعلیم تھی۔ علم و ادب، فلسفہ و مذہب تاریخ و فنون لطیفہ کی زبان فارسی تھی۔ شہروں میں ہی نہیں، دیہاتوں اور قصبوں کے مکتبوں میں بھی فارسی کا چرچا تھا۔ سنسکرت کے علاوہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں یہاں کے علوم و فنون و ادب و الہیات کے خزانوں کی کسی دوسری زبان میں اس طرح تخلیق نہیں ہوئی تھی جس طرح کہ فارسی میں۔ تمام وہ لوگ جو حکومت سے تعلق رکھتے تھے، تمام پڑھے لکھے لوگ اور اس زمانے میں تعلیم

آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ شاعر اور ادیب اور مصنف فارسی جانتے تھے اور اسی میں لکھتے تھے۔ ہندو راجاؤں کے درباروں کی زبان بھی فارسی ہو گئی تھی۔ تعداد کے اعتبار سے وہ ہندو جو فارسی جانتے، لکھتے اور پڑھتے تھے، مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے۔ ان میں سے فارسی زبان کے بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے ہیں، جن کے نام آج تک فارسی داں احترام سے لیتے ہیں۔ ان میں منشی مادھو رام صاحب انشائے مادھو رام اور ٹیک چند بہار، صاحب بہار عجم چندر بھان برہمن اور مرزا منوہر توسنی خاص پر قابل ذکر ہیں۔

فارسی کی اس مقبولیت اور اہمیت کے باوجود ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ عام لوگوں کی روزمرہ بولی فارسی نہیں تھی۔ دلی اور اس کے اطراف کی کھڑی بولی نہ صرف عام لوگ بولتے تھے بلکہ دلی کے اونچے گھرانوں کے لوگ بھی بولنے لگے تھے۔ چنانچہ ولی جب اٹھارھویں صدی کے شروع میں دلی میں وارد ہوئے تو ان کا کلام لوگوں کی سمجھ میں بھی آیا، اور لوگ اس سے محظوظ بھی ہوئے۔ اس لئے کہ وہ قریب قریب اسی بولی میں تھا جو دلی کے ہر گھر میں بولی جاتی تھی۔ جب سودا کے استاد حاتم نے، ولی کے دیوان کو دیکھ کر طبع آزمائی شروع کی، تو تاریخی اعتبار سے زمانہ اس کے لئے تیار ہو چکا تھا کہ فارسی کو بے دخل کر کے اس سودیشی ہندستانی بولی کو ادبی مسند پر بٹھایا جائے۔

دہلی میں اردو کے پہلے شاعر حاتم، خان آرزو، تاجی، آبرو، تاباں، سب کے سب فارسی کے شاعر اول تھے اور اردو کے بعد کو۔ اسی لئے ہمیں نظر

آتا ہے کہ ان کے کلام میں دکنی شاعروں کے مقابلے میں ہندی الفاظ کم ہیں، فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں زیادہ ہیں۔ فارسی سے اردو میں تبدیلی کا ابتدائی دور کچھ ایسا ہی ہونا لازمی بھی تھا۔ اٹھارھویں صدی کے "اردو اساتذہ کے بقول مداصل "یہ ریختہ زبان پختہ ہوئی اور اس نے ایک مستقل ادبی حیثیت اختیار کی۔ مرزا مظہر جانِ جاناں، مرزا رفیع سودا، میر تقی، سوز، میر درد، شعرا کے اس بہت بڑے گروہ کے سردار اور رہنما ہیں جنھوں نے اردو کو اس کی موجودہ صفائی، سلاست اور شیرینی عطا کر کے ہندستان کی ایک بڑی زبان بنا دیا۔

میر اور سودا کا عہد، اور اس سے بھی زیادہ ذوق، غالب، مومن، اور لکھنؤ کے ناسخ، آتش، اور انیس کا دور اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے وسط تک کا دور ہے۔ اس زمانے کی بعض خصوصیات لسانی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ مغل سلطنت کے انحطاط کے زمانے میں لکھنؤ، رام پور، عظیم آباد، مرشد آباد وغیرہ کے ایسے مرکز قائم ہوئے جہاں پر اس زبان کے بولنے والوں اور ادیبوں کا جسے اب لوگ رفتہ رفتہ اردو کہنے لگے تھے اجتماع ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کے ختم اور انیسویں صدی کے شروع میں شمالی ہندستان کے شہروں میں اردو بڑی تیزی سے پھیلی۔ استادوں کی تازہ غزلیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تبرک کی طرح سے لے جائی جاتی تھیں۔ جگہ جگہ غزل گو شاعروں کے گروہ پیدا ہو گئے تھے جو مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تھے، اس طرح گویا ان مقامات پر بھی جہاں کے عام لوگوں کی بولی، دلی اور آگرہ کی طرح اردو نہیں تھی یہ زبان پھیل گئی۔ اوپر کے درمیانی طبقے کے اور پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان اسے

پڑھنے بھی لگے اور اس میں شاعری کرنے لگے۔ شعر کے ذریعے سے یہ زبان عام لوگوں تک بھی پہونچی اور شہروں میں عام طور سے سمجھی جانے لگی۔ اوپر کے طبقے والے ہندو اور مسلمان اسے بولنے بھی لگے۔ جو لوگ صدیوں سے فارسی کی روایات میں ڈوبے ہوئے تھے ان کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا۔ حالانکہ شمالی ہندستان کے دیہاتوں میں اور ایک حد تک شہروں میں بھی، عام لوگ اپنی مقامی بولیاں بولتے تھے (مثلاً برج بھاشا، اودھی، پوربی، میتھلی وغیرہ) حالانکہ ہندو راجاؤں کے درباروں میں پریاگ، کاشی، متھرا اور اجودھیا کے ہندو مرکزوں میں برج بھاشا میں شاعری برابر ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی، پھر بھی اس میں شک نہیں ہے کھڑی بولی اردو کی شکل میں شہروں کے اوپری ہندو مسلم طبقوں میں لکھی، پڑھی اور بولی جانے لگی، اور عام ناخواندہ لوگ اگر اسے بولتے نہیں تو کم از کم سمجھنے ضرور لگے۔ منشیوں، مولویوں، معلموں، حکومت کے افسروں، زمینداروں، منصب داروں اور جاگیرداروں کے ذریعے وہ باہر سے دیہاتوں میں گھس گئی۔ اور وہاں بھی لوگ اُسے سمجھنے لگے۔ ہندوؤں نے بھی اس میں شاعری شروع کر دی اور اس کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا۔

بعض لوگ اس دور کی اردو پر یہ اعتراض کرتے ہیں (مثلاً بابو پرشوتم داس ٹنڈن، آنجہانی پنڈت پدم سنگھ شرما وغیرہ) کہ اس زمانے میں اردو میں سے ہندی کے الفاظ بہت بڑی تعداد میں ترک کر دیئے گئے۔ فارسی کی ضرورت سے زیادہ اس ہندی یا کھڑی بولی میں آمیزش کی گئی اور اس طرح سے گویا اردو والوں نے اردو اور ہندی کے درمیان وہ علیحدگی شروع کی جس کا نتیجہ آج ہم

دیکھ رہے ہیں۔

میری رائے میں یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ متروکات کے سلسلے میں سب سے زیادہ اعتراض ناسخ پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ناسخ اور ان کے طرز کی اردو تمام اردو دانوں کے لئے اور ہمیشہ کے واسطے کوئی اٹل قانون کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر ایک طرف ناسخ ہیں، تو دوسری طرف نظیر اکبر آبادی بھی ہیں جو عوام سے زیادہ قریب تھے اور جو دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کے بنائے ہوئے قانون کا اپنے کو قطعی پابند نہیں سمجھتے تھے۔ ہندی کے الفاظ کو ترک کرنا تو درکنار، نظیر نے عام بول چال کے صدہا نئے الفاظ استعمال کر کے انھیں ادبی درجہ دے دیا ہے۔

دوسرے یہ کہ ناسخ اور اس زمانے کے شعرا نے اردو کو صاف کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ ٹھیٹھ ہندی یا سنسکرت آمیز الفاظ کو ترک کر دیا جائے۔ ان کی کد و کاوش کا مدعا الفاظ اور محاوروں کا صحیح اور مناسب استعمال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جملوں کی بندش سست اور ڈھیلی نہ ہو۔ اور یہ ایک بہت ضروری کام تھا۔ اگر انھیں ٹھیٹھ ہندی الفاظ سے نفرت ہوتی تو ان میں سے ایک نے رانی کیتکی کی کہانی نہ لکھی ہوتی، جس میں فارسی، عربی اور گنوارو الفاظ کو ترک کر کے گویا خالص اردو یا ہندی لکھی گئی ہے۔

تیسرے یہ کہ اردو میں فارسی اور مروج عربی الفاظ کے استعمال سے وطن سے مغائرت کا جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔ آٹھ سو سال سے شمالی ہندستان

میں فارسی کلچر کی سب سے بڑی زبان تھی۔ اب جو لوگ، اور ان میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں، اپنے اس آٹھ صدی کے تہذیبی ترکے کو ہندستان کی کھڑی بولی میں شامل کرتے ہیں، ایسا ترکہ جو اب بالکل ہندستانی بن گیا تھا، وہ اردو میں غیر ملکی فضا پیدا کرنے کے مجرم کس طرح کہے جا سکتے ہیں؟ انھوں نے تہذیب و تمدن کے اُن شاندار درختوں کو جو صدیوں سے یہاں کی سرزمین میں پھل پھول رہے تھے، اردو کے نئے لگائے ہوئے باغ میں منتقل کر کے ہماری کلچر کو مالا مال کیا۔ اس کا ثبوت کہ یہ ایک فطری اور ضروری عمل تھا یہ ہے کہ اردو کے بعض ہندو اساتذہ کے کلام میں مسلمانوں کے مقابلے میں فارسیت زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً لکھنؤ کے پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم، میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے مقابلے میں زیادہ فارسی آمیز ہے۔

کھڑی بولی میں فارسی اور فارسیت کی آمیزش اس عہد میں اتنی ہی فطری اور لابدی تھی، جتنا کہ کیشو داس، دیو اور بھوشن کی برج بھاشا میں سنسکرت کی آمیزش۔ دونوں اپنے اپنے روایتی تہذیبی مرکز سے کسب فیض کر کے اپنی اپنی زبانوں کا دامن وسیع کر رہے تھے۔

انیسویں صدی اور ہندی اُردو کا جھگڑا

انیسویں صدی میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور وہاں انگریز افسروں کے درس کے لئے اردو اور ہندی میں فارسی اور سنسکرت اور عربی کتابوں کے ترجمہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں میر امن نے قصۂ باغ و بہار و چہار درویش دلی

کی صاف شستہ اور سہل زبان میں لکھا۔ افسوس نے گلستاں کا اردو میں ترجمہ کیا اور قصہ حاتم طائی لکھا۔ سید حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی لکھی اور آگرہ کے رہنے والے ایک گجراتی برہمن للو لال جی نے تین کتابیں اردو میں لکھنے کے بعد اپنی مشہور ہندی کی کتاب پریم ساگر لکھی ۔ فورٹ ولیم کالج میں ہی بہار کے رہنے والے سدل مصر نے ہندی کی ایک دوسری کتاب میں "ناسکیتو پاکھیان" لکھی ۔

ان دونوں ہندی کی کتابوں کی خصوصیات کیا تھیں۔ پہلے یہ کہ دونوں کھڑی بولی میں لکھی گئی تھیں۔ حالانکہ للو لال جی کی ہندی میں برج بھاشا کے اثرات نظر آجاتے ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان دونوں کتابوں کی زبان کو کھڑی بولی کہا جاسکتا ہے۔ دوسری خصوصیت اس ہندی کی یہ تھی کہ اس میں فارسی اور عربی کے مروجہ الفاظ حتی الامکان استعمال نہیں کئے گئے تھے۔ اگر ہم یہ خیال میں رکھیں کہ ابھی تک کھڑی بولی کی مروجہ شکل عام طور سے وہی تھی جو اردو کی شکل میں نظر آتی تھی، تو یہ چیز بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کھڑی بولی ہونے ہوئے بھی اس میں سے فارسی اور عربی کے وہ الفاظ تک خارج کر دیئے جائیں جو عام طور سے بول چال میں رائج تھے ۔ اور جن سے للو لال جی اردو کے بھی ادیب ہونے کی حیثیت سے بخوبی واقف تھے۔ تیسری خصوصیت اس زبان کی یہ تھی کہ وہ ناگری رسم خط میں لکھی گئی تھی۔

جس طرح ہندی کے طرفدار اردو پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ تاسی اور دوسرے اردو شاعروں نے ہندی کے الفاظ کو متروکات بناکر اردو کو غیر ملکی الفاظ سے بھر دیا اور اس طرح مشترکہ زبان کی جڑ پر کلہاڑی ماری، اسی طرح اردو

کے طرفدار کہتے ہیں کہ ساری خرابی کی جڑ للو لال جی ہیں، جنھوں نے انگریزوں کے قائم کئے ہوئے فورٹ ولیم کالج میں بیٹھ کر ایسی نئی زبان گڑھنے کی کوشش کی جس نے ہندی اور اردو کو جدا جدا کر کے ہمارے درمیان پھوٹ کا بیج بویا۔

حقیقت نہ یہ ہے اور نہ وہ۔

للو لال جی کی ہندی دراصل اُس اَودھی اور برج بھاشا کے ادب کی ارتقائی شکل ہے۔ جس کا غیر منقطع سلسلہ کبیر داس کے زمانے سے جاری تھا کبیر داس کے بھی پہلے شورسینی اپ بھرنش میں لکھی ہوئی ویرگاتھاؤں پرتھی راج راسو، بیسل دیو راسو، کھمان راسو وغیرہ سے اُس کا سلسلہ ملتا ہے۔ یہ شمالی ہندوستان میں ہندو تصورات، ہندو روایات اور ہندو مذہبی اور تہذیبی رجحانات کا ایک لگاتار سلسلہ ہے۔ جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے پہلے شورسینی پراکرت کی اپ بھرنش سے جا ملتا ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے اس تہذیبی دھارا پر گہرے اثر پڑے، اس میں تبدیلیاں ہوئیں، پھر بھی وہ پوری آن بان کے ساتھ جاری رہا۔

لیکن اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر للو لال جی نے برج بھاشا یا اَودھی میں کیوں نہیں لکھا؟ انھوں نے کھڑی بولی کیوں استعمال کی اور کھڑی بولی استعمال کرنا تھی تو اس میں تبدیلی کیوں کی؟ للو لال جی کے کھڑی بولی استعمال کرنے کا سبب یہ ہے کہ اپنی اردو کی شکل میں اسے عام مقبولیت ہو چکی تھی اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کافی پھیل گئی تھی اس لحاظ سے وہ برج بھاشا سے بازی لے گئی تھی۔ تمام پڑھے لکھے ہندو

جو للولال جی اور سدل مصر اس سے واقف تھے۔ لیکن اس کے علاوہ برج بھاشا اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ اس لئے ایسے لوگوں کے لئے یہ کوئی مشکل اور غیر فطری امر نہ تھا کہ وہ کھڑی بولی کے نحوی ڈھانچے میں، جسے وہ جانتے اور بولتے تھے، ہندو تصور، مذہب اور روایات سے متحرک ہو کر، برج بھاشا، اودھی اور سنسکرت کے ادب میں ڈوب کر، ایسی زبان لکھیں جو اس کی اردو شکل سے، جو مختلف روایات کی حامل تھی، بڑی حد تک علیحدہ ہو۔

ہندی ادب کے بعض تاریخ نگاروں نے اردو والوں کے اس الزام سے بچنے کے لئے کہ ان کا کھڑی بولی کا یہ نیا استعمال مصنوعی اور غیر فطری ہے بہت سے دلائل پیش کئے ہیں جن میں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید ہندی کو اردو سے کوئی تعلق نہیں اور سنسکرت آمیز کھڑی بولی کی روایات اردو سے الگ اور مستقل طور پر صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔ مثلاً انھوں نے کہا ہے۔ اکبر کے زمانے میں گنگ کوی نے ناگری رسم خط میں ایک رسالہ "چند چھند برنن کی مہیما" لکھا جس میں کھڑی بولی کا ہندی روپ ملتا ہے۔ اس کے بعد رام پرشاد نرنجنی نے، للولال جی سے ۳۲ سال پیشتر، ایک کتاب، بھاشا یوگ وشسٹ کے نام کی لکھی جس میں اسی قسم کی ہندی ملتی ہے۔ اسی طرح منشی سدا سکھ لال کی سکھ ساگر، اور انشاء اللہ خاں کی، رانی کیتکی کی کہانی بھی ٹھیک اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے جب کہ للولال جی کی پریم ساگر لکھی گئی۔ اس سے یہ چیز تو یقینی ثابت ہو جاتی ہے کہ للولال جی کھڑی بولی ہندی نثر کے پہلے لکھنے والے نہیں ہیں، لیکن یہ نہیں ثابت ہوتا کہ انیسویں صدی کی جدید ہندی نثر کھڑی بولی کی اردو شکل سے متاثر

ہو کر پیدا نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں اس کے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں، تعصب کی اور بات ہے۔ پروفیسر سنتی کمار چیٹرجی اپنی کتاب "انڈو آرئینس اینڈ ہندی" میں اس کی تصدیق کرتے ہیں:۔

"سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندی یا ہندستانی کا پھیلنا، مرکزی مغل حکومت کا ہندستان پر سب سے بڑا احسان ہے۔ یہ زبان دہلی دربار کے وقار کے ساتھ ہر جگہ پہونچ گئی۔ فارسی کی قدر پیچھے ہٹ گئی۔ ہندی یا ہندستانی جس میں کسی قدر فارسیت شامل تھی یا زبانِ اُردوئے معلے یا درباری زبان ان لوگوں میں رائج تھی، جن کو دربار سے کچھ بھی تعلق تھا، خواہ وہ فوج کے لوگ ہوں یا سرکاری عہدوں پر فائز ہوں۔ مغل سلطنت کے مختلف صوبوں میں اٹھارھویں صدی میں یہی کیفیت تھی"

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ جدید ہندی نے کھڑی بولی کا ڈھانچہ اردو سے لیا، لیکن اس میں ان الفاظ، بندشوں اور ترکیبوں کو اور ان خیالات اور ادبی روایات کی روح بھری جو ہندو تہذیب کے زیر اثر صوبوں سے آئیں، جیسی برج بھاشا، اور شمالی ہند کی دیگر عوامی بولیوں میں (مثلاً بریلی، راجستھانی میتھلی) میں برابر موجود تھیں اور جن کا مسلسل ارتقاء ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں نہ صرف یہ کہ یہ سلسلہ منقطع ہوا، بلکہ اس میں زبردست ترقی ہوئی تھی، خود مسلمانوں نے اس ترقی میں معتدبہ حصہ لیا تھا۔ وہ عوام جو شمالی ہند کے

گاؤں گاؤں میں کبیر کے دوہے، تلسی کی رامائن، میرابائی اور سورداس کے گیت آلھا اودل سننے اور سمجھنے کے عادی تھے، وہ طبقے جو برج بھاشا کی زبردست اور زندہ ادبی تحریک کو تین سو سال تک برابر آگے بڑھاتے رہے تھے، ان تمام لوگوں کے لئے جدید ہندی تعصب، فرقہ پرستی یا تنگ نظری کی پیداوار نہ تھی، وہ ان کے تہذیبی ارتقا کا منطقی نتیجہ تھی۔

انیسویں صدی کے وسط کے بعد یہ چیز اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ انگریزی عملداری کے ساتھ ساتھ ہندستان کے رہنے والے مختلف لوگوں میں قومی احساس بھی پیدا ہو رہا تھا۔ مثلاً راجا رام موہن رائے نے انگریز عیسائی مشینریوں کے حملے سے ہندو مذہب کو بچانے کے لئے، ہندو مذہب کا ایک نیا تصور برہمو سماج کی شکل میں پیش کیا، اور ان کی تحریک جدید بنگالی کلچر کے احیاء کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بن گئی۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر ہندی ادب کی پہلی بڑی شخصیت بھارتندو ہریش چندر نے بنارس سے اپنا ادبی رسالہ جاری کیا۔ بنگالی سے متعدد ڈرامے ہندی میں ترجمہ کئے۔ اور اپنے ارد گرد ہندی کے ادیبوں کا ایک ایسا گروہ بنایا جس کی تحریروں سے درمیانی طبقے کے پڑھے لکھے ہندوؤں سے وہ پست ہمتی دور ہوئی جو انگریزی غلامی کی وجہ سے اس ملک میں پیدا ہو گئی تھی۔

بھارتندو کے ڈراموں اور ان کی تحریروں میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ اگر ایک طرف قدیم ہندو دیومالا اور ہندو تاریخ کی قابل فخر ہستیوں کو اپنے ڈراموں میں پیش کر کے ہندوؤں کو ان کے شاندار ماضی اور ان کی بلند اخلاقی اور

روحانی روایات یاد دلا کر اُن کے سر کو اونچا کرنا چاہتے ہیں، تو دوسری طرف وہ ہندو سماج کی خرابیوں کے سخت نکتہ چین بھی ہیں۔ بھارتندو نے رجعت پرست پنڈتوں کا مذاق اُڑایا۔ تعلیم نسواں کی حمایت اور جدید تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ جدید ہندوستان میں قومی بیداری اور حب وطن کے ابتدائی مظاہر ہمیں اسی طرح کے نظر آتے یعنی اپنی قوم کے احساس پستی کو دور کرنے کے لئے اُسے اس کے شاندار ماضی کی یاد دلانے، دوسرے جدید دنیا میں سربلند ہونے کے لئے مغربی تعلیم حاصل کرنا اور اپنے سماج میں اصلاح کرنا۔

بھارتندو کی تحریروں کی زبان پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس میں روانی اور زور کے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ اپنی ہندی میں عربی اور فارسی کے مروّج الفاظ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریر ہندی ہوتی ہے۔ اس میں سنسکرت کی آمیزش ہوتی ہے، اور وہ برج اور اَودھی کی روایات کا بھی دامن نہیں چھوڑتی۔ اس لحاظ سے اس میں اور مروجہ اردو نثر کے طرز میں کافی فرق ہے، لیکن للولال جی کی خالص فارسی اور عربی مروجہ الفاظ سے معرّا ہندی یہ نہیں ہے۔

انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہندو مذہب میں اصلاح کی دو اور تحریکیں بھی اٹھیں جن کا ہندی ادب پر اثر پڑا۔ ایک سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ سماج کی تحریک جس کی باقاعدہ بنیاد ۱۸۷۵ء میں پڑی، اور دوسری سناتن دھرم کے حلقے میں رہتے ہوئے مذہبی تجدید کی تحریک جس کے بہت بڑے مبلغ پنڈت شردھا رام پھلوری تھے۔ ان دونوں تحریکوں کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی

تھا کہ ہندی زبان کو زیادہ سے زیادہ ترویج دی جائے ۔ سوامی دیانند سرسوتی نے ہندی کو آریہ بھاشا کا نام دے کر اس کی ترقی کو ہر ایک ہندو کا مذہبی فریضہ قرار دیا ۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی شمالی ہند میں (خاص طور پر یو۔ پی بہار راجستھان اور صوبہ متوسط کے ہندستانی حصہ میں) ہندو قومی بیداری کا جس کے مختلف پہلو مذہبی احیا اور تجدید، سوشل ریفارم، اور جدید تعلیم میں ایک زبردست آلہ کار بن گئی اور ان تمام تحریکوں کے ساتھ ساتھ اُسے بہت ترقی ہوئی ، اسکولوں کالجوں اور کچہریوں میں ہندی اور ناگری رسم خط کے استعمال کا زبردست مطالبہ کیا گیا اور اُسے کامیابی ہوئی ۔ بیسویں صدی کے شروع میں ناگری پرچارنی سبھا قائم ہوئی اور اس کے چند سال بعد ، ہندی ساہت سمیلن کی بنیاد پڑی ۔ ہنجا اور رسالے بڑی تعداد میں شائع ہونے لگے ، رفتہ رفتہ برج بھاشا کو ترک کر کے کھڑی بولی ہندی میں شاعری بھی ہونے لگی ۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں جب قومی بیداری کی ایک نئی لہر کانگرس اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں اٹھی تو اس کے بعد ہندوؤں میں ہندی کو اور بھی زیادہ فروغ ہوا بابو میتھلی شرن گپت نے اپنی مشہور نظم بھارت بھارتی اسی زمانے میں لکھی یہ نظم اُن گاندھیائی تصورات کی جو اس زمانے میں شمالی ہندستان کے ہندوؤں کو متحرک کر رہے تھے بہترین نمایندگی کرتی ہے ۔ پنڈت رام چندر شکل بھارت بھارتی کے مصنف کے متعلق لکھتے ہیں ۔

" ہندی بھاشا جنتا کے پرتی ندھی کوی یے نسندیہ تھے "

> جا سکتے ہیں۔ بھارت اینڈو کے سمے سے سودیش پریم کی بھاونا جس روپ میں چلی آ رہی تھی اس کا وکاس بھارت بھارتی میں ملتا ہے۔ ادھر کے راج نیتک آندولنوں نے جو روپ دھارن کیا اس کا آبھاس پچھلی رچناؤں میں ملتا ہے۔ ستیہ گرہ، اہنسا، منشویتہ واد، وشو پریم، کسانوں اور شرم جیون کے پرتی پریم اور سمّان سب کی جھلک ہم پاتے ہیں۔"

(ہندی ساہت کا اتہاس، ۶۸۷ - ۶۸۶)

یہ بلاشبہ اُس عوام کے نمائندہ شاعر کہے جا سکتے ہیں جس کی زبان ہندی بھاشا ہے۔ بھارت اینڈو کے وقت سے حب الوطنی کا جذبہ جس شکل میں بڑھتا آ رہا تھا اس کا ارتقا "بھارت بھاست بھارتی" میں ملتا ہے۔ پچھلی سیاسی تحریکوں نے جو شکل اختیار کی اس کا کچھ اندازہ آخیر کی تصانیف میں ملتا ہے۔ ستیہ گرہ۔ عدم تشدد۔ انسان دوستی اور آفاقی محبت" کسانوں اور مزدوروں کی محبت اور عزت ان میں سب کی جھلک ہم پاتے ہیں۔

اسی قومی بیداری کا نتیجہ ہے کہ ناول، افسانے، شعر و نظم، ڈرامے، تنقیدی مضامین اور کتابیں، تاریخ، معاشیات، فلسفہ، الٰہیات اور سیاسیات کا ایک بڑھتا اور پھیلتا ہوا تہذیبی سیلاب ہندی زبان کے ذریعہ سے ہزاروں لاکھوں ذہنوں کو سیراب کر رہا ہے۔

اُردو، انیسویں اور بیسویں صدی میں

آئیے اب کھڑی بولی کی دوسری شکل اُردو پر ہم نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں اس کا ارتقا کس طرح ہوا۔

شمالی ہندستان کے مسلمانوں میں، ہندوؤں کی طرح قومی بیداری اپنے ابتدائی دور میں تین شکلیں اختیار کرتی۔ ایک تو تجدید اور احیائے دین کی تحریک دوسرے سوشل ریفارم اور تیسرے جدید تعلیم کی تحریک۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے بھی تیرہ چودہ سال پہلے شاہ ولی اللہؒ دہلوی صاحب کے صاحب زادے شاہ رفیع الدینؒ صاحب نے قرآن شریف کا پہلا ترجمہ اردو میں کیا (۱۷۸۸ء) آپ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے اس سے بھی زیادہ سلیس زبان میں دوبارہ قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور اردو میں اس کی تفسیر بھی لکھی۔ اسی تحریک سے وابستہ شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ بھی تھے۔ ہم جانتے ہیں ان کے اور اُن کے رفیقوں کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک جہاد جاری ہوئی جس میں ہزاروں مسلمان شریک ہوئے۔ یہ تحریک عام لوگوں کی تحریک تھی اس لئے اس کے رہنماؤں نے اس کے نظری اُصول اردو میں مذہبی رسائل کے ذریعے بیان کئے۔ حضرت اسمٰعیل شہید نے توحید، صراط مستقیم، تنویر العینین نام کے رسالے اردو میں لکھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد علماء کی یہ تحریک کچھ دنوں کے لئے دب گئی۔

یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ سر سید احمد خاں، اپنی جوانی میں، اس

تحریک سے متاثر تھے اور انھوں نے بھی ان مخصوص عقائد کی حمایت میں جو وہابیت کے نام سے مشہور ہیں ایک یا دو رسالے لکھے۔

شمالی ہندستان کے مسلمانوں کی قومی بیداری دراصل سرسید احمد خاں کی اس تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے وابستہ ہے جو انھوں نے انیسویں صدی کے آخری برسوں میں شروع اور جاری کی۔ اردو نثر کی جدید شکل تہذیب اخلاق میں لکھنے والوں نے بنائی یا ان لوگوں نے جو دہلی کالج سے وابستہ رہ چکے تھے اور مغربی تہذیب اور ادب کے زیر اثر اردو ادب کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد دہلی کالج سے نکلے تھے۔ اسی طرح مولانا حالی جنھیں آزاد کے ساتھ جدید اردو نظم کا موجد کہا جاسکتا ہے، علی گڈھ کی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنا مسدس مدوجزر اسلام سرسید کے کہنے سے لکھا تھا۔

مسدس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے شاندار ماضی اور ہندستانی مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کو، سماجی اصلاح، تعلیم و ہمت کی ترغیب دینے کے لئے بہت موثر اور دلچسپ اور سلیس انداز میں بیان کیا گیا تھا۔

بیسویں صدی کے شروع میں جب محض تعلیمی اور اصلاحی دور کا خاتمہ سا ہوا اور سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ آزادی کے خیالات بھی مسلمانوں میں پھیلنے لگے تب اُردو ادب نے ایک اور کروٹ لی، اور شبلی، ظفر علی خاں، ابوالکلام اور آخر میں اقبال مسلمانوں کی نئی قومی بیداری کی ترجمانی کرنے لگے۔

اس بیداری کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مسلمانوں میں عام طور سے اردو کو ترقی دینے اور اس کے تنگ نظر اور متعصب دشمنوں سے بچانے کا بھی زبردست جذبہ ان میں بیدار ہوا، اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک کے ایک جزو کی حیثیت سے انجمن ترقی اردو بھی قائم کی گئی۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ جدید اردو کی ترقی، ہندستانی مسلمانوں کی گذشتہ سو سال کی قومی بیداری سے وابستہ ہے اور اسی کے ساتھ ہوئی تو اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ اردو ادب کی ترقی میں ہندوؤں کا جو حصہ رہا ہے گھٹانا چاہتا ہوں یا اس کی اہمیت کو کم کرنا چاہتا ہوں رتن ناتھ سرشار، سرور جہاں آبادی اور چکبست جیسے ادیبوں کے نام معمولی حیثیت نہیں رکھتے اس لئے کہ انھوں نے ہمارے ادب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مجھے اس کا بھی پورا احساس ہے کہ اگر ہمارے دور جدید کا سب سے بڑا اردو شاعر اقبال ہے، تو اسی عہد کا سب سے بڑا ناول نگار اور افسانہ نویس پریم چند ہے، اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ اردو کے ترقی پسند شاعروں میں اگر ایک طرف جوش ملیح آبادی جیسے استاد ہیں، تو دوسری طرف فراق ہیں۔ کرشن چندر، اشک اور بیدی کی تخلیقی اہمیت ظاہر ہے۔

پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ وہ اشتراک جو اردو کے ان ہندو اردو دانوں اور ان کے علاوہ زمانہ گذشتہ اور حال کے اور بھی بہت سے غیر مسلم اردو دانوں اور مسلم اردو دانوں میں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ہندو عام طور سے اردو داں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کا غالب عنصر پہلے بھی اور آج اور بھی

زیادہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اسی وجہ سے اردو ادب کے غالب حصے پر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی چھاپ ہے۔ بالکل اسی طرح ہندی کے غالب عنصر پر ہندو تہذیب کے آثار نمایاں ہیں۔ یہاں پر میں یہ چیز صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ جب میں ہندو تہذیب یا مسلم تہذیب کا نام لیتا ہوں تو میری مراد مذہبی فرق سے نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی تہذیب اس ملک کے مختلف حصوں میں مختلف شکلیں رکھتی ہے اور ان میں بے شمار باتیں مشترک ہیں۔ پھر بھی ان علاقوں میں جہاں اردو یا ہندی عام طور سے بولی جاتی ہے، ہندو اور مسلم کلچر کا فرق ہمیں اردو اور ہندی کی موجودہ ادبی شکلوں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

مشترک باتیں

اصل یہ ہے کہ اردو اور ہندی، اپنی موجودہ ادبی اور تحریری شکل میں الگ الگ ہیں۔ حالانکہ ان کی نحوی ساخت بنیادی طور سے ایک ہے۔ اب یہ بحث کہ یہ دونوں ایک زبان کی دو شاخیں یا دو علیحدہ اور مستقل زبانیں ہیں، کچھ بے کار سی معلوم ہوتی ہے۔ علم لسان کی رو سے، جیسے کہ ڈاکٹر تارا چند صاحب اور بعض دیگر علما کا فرمانا ہے ان کو الگ الگ دو زبانیں کہنا غالباً صحیح نہیں ہے بہرحال ان کا فرق ظاہر ہے اور اس فرق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ ہماری کلچر کے دو متوازی دھاروں کی آئینہ دار ہیں۔ دونوں ہمارے ملک کی فطری اور تاریخی پیداوار ہیں۔ دونوں ہندوستانی ہیں سو دونوں کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کا برابر حق ہے۔

تو کیا اس کے معنے یہ ہیں کہ ہندستان کے ان علاقوں میں جہاں اُردو یا ہندی اس وقت بولی جاتی ہیں۔ اردو اور ہندی کی تعلیم جب عام لوگوں کو الگ الگ دی جائے گی تو رفتہ رفتہ ایسی صورت پیدا ہو جائے گی کہ اردو بولنے والے ہندی بولنے والوں کی باتیں نہ سمجھ سکیں گے۔ اور ہندی بولنے والے اردو بولنے والوں کی باتیں نہ سمجھ سکیں گے؟ یا یہ ہوگا کہ اسکول، کالج، یونیورسٹیاں تمام تعلیمی اور ادبی ادارے اردو اور ہندی میں بٹ جائیں گے، ایک شہر اور ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کی بولی تک نہ سمجھ سکیں گے؟

اگر ہم اپنے کلچر کے معاملات کو حقیقت پسندی، انصاف، اور باہمی مفاد کے اصول پر عمل کریں تو ہرگز اس قسم کی علیحدگی نہ ہوگی۔ سیاست کی طرح تہذیبی امور میں حقیقت کو اس کی مکمل اور مختلف شکلوں میں اور پہلوؤں سے دیکھ کر اور سمجھ کر ہی ہم ایسے نتائج پر پہونچ سکتے ہیں جو سب کو قابل قبول ہوں اور جس میں سب کا بھلا ہو۔

اُردو اور ہندی کے جو مختلف پہلو ہیں انھیں ہم نے دیکھ لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں کون سی باتیں مشترک ہیں۔

سب سے پہلے اردو اور ہندی میں جو شئے ہمیں مشترک نظر آتی ہے وہ ان دونوں کی بولیاں ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام بول چال کی زبان بہت بڑی حد تک مشترک ہے۔ یہ زبان جسے عرف عام میں "ہندستانی" کہتے ہیں۔ یو پی، دہلی، بہار، وسطی ہندستان، راجستھان، حیدرآباد اور مشرقی پنجاب کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔ دیہاتوں میں جہاں ہندستانی کی مختلف بولیاں

لوگ بولتے ہیں) لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ سارے ہندستان کے شہروں میں ٹوٹے پھوٹے انداز میں یہ سمجھ لی جاتی ہے۔ بمبئی، کلکتہ، احمد آباد کی کثیر آبادیاں اسے بول اور سمجھ لیتی ہیں۔ غیر ہندستانی علاقوں کے بہت سے لوگ جو قومی جذبے کے ماتحت اردو یا ہندی پڑھتے لکھتے ہیں اس مشترک زبان کو بول اور سمجھ لیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اُردو اور ہندی ادب میں بھی بعض بعض جگہوں پر ہمیں اس کے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی اور حالی کے کلام کے بعض حصے۔ ہم چاہے سہل اُردو کہیں چاہے سہل ہندی۔

تیسرے یہ مشترک زبان ہماری بیشتر فلموں میں استعمال ہوتی ہے۔

چوتھے عام جلسوں میں تقریر کرتے وقت اچھے مقرر اس مشترک زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ گاندھی جی۔ جناح صاحب، پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد، مزدور تحریک سے تعلق رکھنے والے اکثر مقرر اسی زبان کو استعمال کرتے ہیں۔

پانچویں، اردو اور ہندی کی نحوی ساخت ایک ہے۔ دونوں کی بنیاد کھڑی بولی ہے، جو مدھ دیش کی شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے۔

مستقبل میں کلچر کا سوال

اردو اور ہندی کی موجودہ پوزیشن اُن میں یکسانیت اور اُن میں علیحدگی کی موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مستقبل

میں "ہندستان کے اُن علاقوں میں جہاں جو اردو یا ہندی" بولی کے علاقے میں[1] کلچر کا سوال کس طرح حل کیا جائے گا؟ ہم اس سوال کو سیاسی اور سماجی سوالات سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم جانتے ہیں کہ سامراجی حکمراں ہماری قوم کے اس اہم سوال کو حل کرنے سے قاصر ہی نہیں رہے۔ ان کے عہدِ حکومت میں کلچر اگر بڑھی ہے تو ان کی مخالفت کے باوجود اور ان کے خلاف جدوجہد کر کے۔ اس کی سب سے بڑی مثال عام تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ہماری قوم میں صرف پندرہ فی صدی آدمیوں کا تعلیم یافتہ ہونا سامراجیوں کی کلچر دشمنی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

صرف ایک آزاد اور جمہوری ہندستان پوری طرح سے مہذب اور متمدن ہندستان ہو سکتا ہے۔

اب اس علاقے میں عام تعلیم کا مسئلہ کس طرح حل کریں گے، جہاں اس وقت دو ادبی زبانیں، ہندی اور اردو رائج ہیں، لیکن جہاں کے لوگ عام طور سے ایک بولی سمجھ اور بول لیتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ جب ہم یو۔ پی، اور بہار کے ہر ایک دیہات اور شہر کے ہر ایک محلے میں اسکول کھولیں گے تو ان میں زیادہ تر ہندو بچے ہندی پڑھیں گے اور زیادہ تر مسلمان بچے اردو پڑھیں گے۔ یہ ان کا جائز اور فطری رجحان ہے۔ ہمیں اس کا انتظام کرنا ہوگا۔ جیوں جیوں ہمارے ملک کے ہندستانی بولنے والے

---

[1] میری مراد اس ... علاقے سے ہے جسے گریرسن نے مغربی اور مشرقی ہندی کے علاقے میں شامل کیا ہے۔

علاقے میں تعلیم بڑھ رہی ہے ہمیں یہ نقشہ صاف نظر آنے لگا ہے۔ ایک سچی جمہوری حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ دونوں زبانوں میں تعلیم کا بندوبست کرے۔

لیکن ہماری زندگی کی ضرورتیں ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے سہنے، ایک دوسرے کے خیالات و جذبات معلوم کرنے، ایک دوسرے کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ہندو اور مسلم عوام کے مقاصدِ زندگی ایک ہوں گے۔ آزادی کی فضا میں خوش حالی کی مہذب اور پُرامن زندگی بسر کرنا جس میں ہماری جسمانی، ذہنی اور روحانی طاقتوں کی بہترین نشو و نما ہو سکے۔

اس لئے اردو جاننے والوں کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ ہندی سے واقفیت حاصل کریں۔ ہندی جاننے والوں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اردو سیکھیں جب ہم ایک دوسرے کے خیالات و جذبات سے واقف ہوں گے ایک دوسرے کے ادب کے بہترین خزانوں سے بہرہ مند ہوں گے تو وہ مروجہ جہالت جو اردو کے طرف داروں میں ہندی کی جانب سے اور ہندی کے حمائتیوں میں اردو کی طرف سے آج موجود ہے کم ہونے لگے گی اور وہ مضحکہ خیز حرکتیں جو آج کل کے بعض ہندی داں اردو کے مروجہ الفاظ کو ترک کر کے، کر رہے ہیں حماقت اور جہالت کی نشانی سمجھی جائیں گی، اسی طرح ہندی الفاظ پر ناک بھوں چڑھانے والوں کو لوگ قابلِ رحم غلامانہ اور متعصب ذہنیت کا شکار سمجھیں گے۔

اس طرح ہندی اور اردو زبانوں کی ایک نئی تکمیل شروع ہوگی اور اس عظیم الشان زبان کے نقوش ابھرنے لگیں گے جو اپنے میں اردو اور ہندی

کی تمام روایات کو، ان کے تمام ادبی خزانوں، ان کی تمام لطافتوں اور شیرینیوں ان کی وسعتوں اور گہرائیوں کو سمٹے ہوئے ہوگی جو ہماری نئی تہذیب کا روحانی تاج محل کہلائے جانے کی مستحق ہوگی اور جسے ہم صحیح معنوں میں "ہندستانی" کا نام دے سکیں گے۔

ہمیں کیا کرنا چاہیئے

یہ خوش آیند مستقبل خود بخود وجود میں نہیں آئے گا۔ تاریخ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کے تقاضوں کو ہم اپنے عمل سے پورا کریں۔ ہمیں تہذیبی اتحاد کی اس مہم میں تنگ نظر عصبیت اور رجعت پرست علیحدگیت کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور انہیں شکست دینی ہوگی۔

ہندی کے طرفداروں میں جو لوگ اردو کے وجود سے انکار کرتے ہیں، جو اردو کو مٹانا چاہتے ہیں ہمیں انہیں سمجھانا ہوگا کہ اس طرح ہندی اور ملک دونوں کا نقصان ہے۔ ہمیں انہیں سمجھانا ہوگا کہ ہمارے ملک میں رہنے والے لاکھوں کروڑوں ہندستانیوں کی ذہنی تربیت اردو کے ہی ذریعہ ہو سکتی ہے اور اس لئے ہر ایک ہندستانی کا قومی فرض ہے کہ اردو کی ترقی کو اچھی نظر سے دیکھے اور حتی الامکان اس کام میں مدد کرے۔

بالکل اسی طرح ہمیں ان لوگوں کو بھی سمجھانا پڑے گا۔ جو ہندی کی مخالفت کرتے ہیں کہ بے شمار ہندستانیوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہندی ہی ہو سکتی ہے اور اس لئے اس کی مخالفت کرنا اپنی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے۔

اردو اور ہندی کی موجودہ علیحدگی کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ علیحدگی کم ہو۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس وقت ہندی اور اردو کا وہ لسانی علاقہ جو دونوں میں مشترک ہے، جسے سہل اردو، سہل ہندی یا ہندستانی کا نام دیا جاتا ہے قائم رہے اور اُسے برابر بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

ہندی کے ترقی پسند ادیب اس رجحان کی مخالفت کریں جس کے ماتحت ہندی میں سے فارسی، عربی یا اردو کے مروجہ اور عام فہم لفظوں کا استعمال ترک کیا جا رہا ہے۔

اردو کے ادیب ٹھیٹھ ہندی یا سنسکرت تدبھو یا ایسے تت سم الفاظ جو مستعمل ہیں یا جو عوام میں بولے جاتے ہیں، ان کو اپنی زبان سے علیحدہ نہ کریں۔

مشترک اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر مشترک تعلیمی اداروں کے معلموں کے لئے ضروری ہو کہ دونوں زبانیں اچھی طرح جانتے ہوں۔

ہندی اور اردو کے مستند علما علمی اور فنی اصطلاحوں کا مشترک لغت تیار کریں۔ جہاں کسی اصطلاح کے لئے ایک لفظ نہ ہو سکے وہاں ہندی اور اردو دونوں کی اصطلاحیں لکھ دی جائیں۔ یہ لغت اردو اور ناگری دونوں رسم خط میں ہو۔

ایسا لغت تیار کیا جائے جس میں ہندی اور اردو دونوں کے الفاظ ہوں اور دونوں زبانوں میں معنے دے دیئے جائیں۔

ادیب دونوں زبانیں سیکھیں اور اس سلسلہ میں ہم پریم چند، اشک،

اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر تارا چند، پنڈت سندر لال کی مثال پر عمل کریں، دونوں زبانیں جاننے سے ادیب آسانی اپنی کتابیں اردو اور ہندی میں شائع کر سکیں گے۔ اس میں ادبی اور مالی دونوں طرح سے اُن کا فائدہ ہے۔

ہم سب کوشش کریں کہ فلموں، ڈراموں، تقریروں، اخباروں اور ریڈیو پر ایسی اردو یا ایسی ہندی استعمال ہو جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آئے ریڈیو پر سے اردو اور ہندی دونوں نشر ہوں۔ لیکن اردو کو گھٹا کر ہندی نہ ہو اور ہندی کے بدلے اردو نہ ہو۔ ساتھ ساتھ مشترکہ ہندستانی، کا بھی پروگرام ہو۔ اردو اور ہندی کے پروگرام حتی الامکان سہل زبان میں ہوں۔

اردو میں ہندی اور ہندی میں اردو ادب کو مقبول بنانے کی کوشش کی جائے۔ اردو کی چیدہ کتابیں ہندی رسم خط میں بھی شائع ہوں تاکہ ہندی والے انھیں آسانی سے پڑھ سکیں، اسی طرح ہندی کی کتابیں اردو رسم خط میں شائع ہوں۔ مشکل الفاظ کے معنے دے دیئے جائیں۔ ہندی اور اردو کتابوں کے ترجمے بھی ایک دوسرے کی زبان میں چھپیں۔ جیسے پریم چند اور اشک، اختر حسین کی کتابوں کے ہوتے ہیں۔

ترقی پسند ادیب اردو اور ہندی کے ادبی اور لسانی اداروں میں شریک ہو کر کام کریں۔ اگر ہندی کے ادیب ہیں تو کوشش کریں کہ ہندی میں اردو کی مخالفت کے رجحانات ختم ہوں، اردو کے ادیب ہندی کے خلاف تعصب کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ سب ایک دوسرے کی زبان سیکھیں اور تعصب کے سبب سے الفاظ کو خارج کرنے کے بجائے دوسری زبان

کے نئے الفاظ کو اپنی زبان میں لے کر کھپا دینے کی کوشش کی جائے

ہندستان کی بین الاقوامی زبان، ہندی اور اردو دونوں ہوں جس کا جی چاہے جونسی زبان سیکھے۔ لیکن یہاں بھی ایسی کوشش جاری رہے کہ ہندی اور اردو کی مشترک چیزیں ابھریں۔

خاتمہ

اب آپ کو ایک چھوٹا سا لطیفہ سنا کر میں اس طولانی داستان کو ختم کرتا ہوں۔ تھوڑے دن ہوئے میں اپنے ان خیالات کا اظہار اردو کے ایک بہت بڑے عالم سے، جن کا میں بے حد احترام کرتا ہوں، کر رہا تھا۔ انھوں نے مجھ سے ناراض ہو کر کہا "آپ دونوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں"۔ میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ انھیں جواب دیا "اس میں ہرج کیا ہے؟"

کیا اردو اور ہندی کی یہ گتھی جو دن بدن زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے کسی ایسے بھی طریقے سے حل ہو سکتی ہے جس سے اردو یا ہندی کی نمو یا ترقی پر ضرب پڑتی ہو؟ صرف وہی حل کامیاب ہو سکتا ہے جو ان دونوں زبانوں کے وجود، ان کے جواز اور ان کی ضرورت کو تسلیم کر کے ایسی راہ نکالے جو متضاد نہ ہو، اور جو ہماری تہذیب کے ان متوازی دھاروں کو اس طرح پھیلنے اور بڑھنے کا موقع دے کہ آگے چل کر وہ ایک دوسرے سے مل جائیں۔